محترمہ نغمہ پروین*

دارالمصنّفین میں سید سلیمان ندویؒ کا اہم کردار

مولانا سید سلیمان ندوی کا شمار دارالمصنّفین کے خاص دانش وروں میں ہوتا ہے اور دارالمصنّفین کے قائم ہونے کے بعد وہ اس کے رہنما و نفس ناطقہ اور روحِ رواں رہے۔ دارالمصنّفین اور سید سلیمان ندوی دونوں لازم وملزوم تھے اس بناء پر مہدی حسن افادی انھیں سید الطائفہ کہا کرتے تھے۔[1]

سید سلیمان ندوی ۲۲/نومبر ۱۸۸۴ء کو دیسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ سید صاحب کے والد سید ابوالحسن طبیب حاذق تھے۔ سید سلیمان ندوی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اسلام پور، پھلواری شریف اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں بھی تھوڑے تھوڑے عرصہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیرِ تعلیم رہے اور یہی پر سات سال قیام کرکے اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور یہیں سے ان کے علمی وادبی ذوق کی نشوونما اور ترقی ہوئی۔ مولانا شبلی نعمانی ۱۹۰۵ء میں جب ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے تو انھوں نے اس جوہر شناس کو اپنی تربیت پناہ میں لیا اور اس کو اس لائق بنایا کہ ۱۹۰۸ء میں تعلیم کی فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں ہی علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوگئے اور اسی دور میں انھوں نے ''دروس الادب'' کے نام سے دو عربی ریڈریں لکھیں جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح سے ان کی بہت سی اعلیٰ ترین تصانیف ہیں جنھیں کافی قدر ومنزلت حاصل ہوئی اور ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں وہ سیرۃ النبی کی تالیف میں مولانا شبلی کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے اور الندوۃ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے منہدم ہوجانے سے وہ بہت متاثر ہوئے جس کی بنا پر انھوں نے ''مشہدِ اکبر'' کے نام سے ایک درد انگیز مضمون لکھا جو کہ رسالہ ''الہلال'' میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا اور جسے حکومت وقت نے اس نمبر کو ضبط کرلیا، اسی زمانے میں اپنی تمام تر مصروفیات کے ساتھ ایک اہم تصنیف ''ارض القرآن'' کی شروعات کی۔[2]

* ریسرچ سکالر، ڈیپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی، علی گڑھ یونیورسٹی

مولانا شبلی نعمانی نے سید سلیمان ندوی کو خاص طور پر تصنیف وتالیف کے لیے تیار کیا تھا۔ جب ان کا آخری وقت آ پہنچا تو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو سیرۃ النبی کو مکمل کرنے کی وصیت کی۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی مشورے سے دارالمصنّفین کی بنیاد ڈالی۔ یہ گویا بغداد کے دارالحکومت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڑھ کی سرزمین پر نمودار ہوا۔[۳]

دارالمصنّفین کے کام کی ابتداء سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''ارض القرآن'' سے کی۔ جب یہ شائع ہوئی تو لوگوں نے اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔[۴] جس سے دارالمصنّفین کے کام کی نوعیت اور سید سلیمان ندوی کی قابلیت اور ان کی تحقیقات اور نظر کی وسعت کا لوگوں کو اندازہ ہوا۔ تمام علمی مصروفیات کے باوجود بھی سید سلیمان ندوی نے بعض سیاسی تحریکات میں بھی حصہ لیا۔[۵]

سید سلیمان ندوی کی صدارت میں جولائی ۱۹۱۶ء میں دارالمصنّفین سے رسالہ ''معارف'' نکلا۔ یہ دارالمصنّفین کا علمی وادبی آرگن تھا۔ یہ اردو کا ایک واحد علمی رسالہ ہے۔ جو تاریخ اشاعت سے لے کر آج تک بنا کسی تاخیر کے شائع ہو رہا ہے۔ اور اس کی روشنی سے علمی دنیا کا ہر گوشہ منور ہے۔[۶]

سید سلیمان ندوی صاحب علمی وادبی فرائض کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ دارالمصنّفین کے رفقاء کے لیے لائحہ عمل اور اس کے مربیوں اور ہمدردوں کا حلقہ بھی پیدا کرتے رہے۔ کیوں کہ دارالمصنّفین قائم ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا میں اعلیٰ ترین مصنّفین کی ایک جماعت پیدا ہو۔ جو اپنی اعلیٰ تصانیف سے لوگوں کو گورکھ دھندوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مرحوم کی تالیف کردہ سیرۃ النبی کی پہلی جلد مرتب کر کے دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی اور ۱۹۲۰ء میں سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لیے بھیج دی۔ اور یہ انھوں نے لندن جانے سے قبل کیا تھا اور لندن پہنچنے کے بعد وہاں سے انھوں نے اس کا دیباچہ لکھ کر بھیجا۔ ابھی وہ لندن میں ہی تھے کہ ان کی کتاب سیرۃ عائشہ شائع ہوئی جسے پڑھ کر ڈاکٹر علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کو یہ تحریر فرمایا کہ:

> ''سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمہ سلیمانی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے''۔[۷]

۱۹۲۲ء تک دارالمصنّفین کا چرچا دنیا کے ہر گوشے گوشے میں ہونے لگا تھا۔ اس کی شہرت اور مقبولیت

کو چار چاند لگ چکے تھے۔[8]

سید سلیمان ندوی کی سب سے آخری تصنیف ''حیات شبلی'' ہے جو کہ ۸۴۶ صفحات پر مبنی ہے۔ یہ ضخیم کتاب صرف سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سال کی علمی وادبی تعلیمی مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے اس کے بعد انھوں نے سیرۃ النبی کی ساتویں جلد لکھنی شروع کی ابھی اس جلد کے کچھ ہی حصے لکھ پائے تھے کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

سید صاحب ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے تھے۔ اور وہیں پر ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کی وفات ہوئی۔ آپ کی شخصیت بڑی پُر وقار اور جامع تھی، ان کے نظریات وخیالات بہت ہی اعلیٰ ترین تھے اور ان کے کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ لہذا ان کی جامعیت کے متعلق علامہ اقبال رقم طراز ہیں:

> ''آج سید سلیمان ندوی علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں۔ مصنف ہی نہیں رئیس المصنّفین ہیں، ان کا وجود علم وفضل کا ایک دریا ہے۔ جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔[9]

سید سلیمان ندوی محققانہ ذہن اور مؤرخانہ بصیرت کے مالک تھے ان کے معلومات کی وسعت اور ان کے افکار وخیالات کا اندازہ ان کی تصانیف کے موضوعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ لہذا ان کے بارے میں ان کے شاگرد اور ان کے سوانح نگار مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں کہ:

> ''مطالعہ کی کثرت اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو نے ان کے دماغ کو مستقل کتب خانہ اور متنوع علمی معلومات کا خزانہ بنادیا تھا ان کی گفتگو علمی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ان کی صحبت سے جو قیمتی معلومات حاصل ہوجاتی تھیں وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے معلومات کی وسعت اور تحقیق وتنقید کا پورا حق ادا کرتے اور اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے۔ مذہبی مباحث سے قطع نظر اور ادب وتاریخ ان کا خاص دائرہ تھا۔ خالص علمی وتاریخی موضوع پر انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر مشکل ہی سے اضافہ ہوسکتا ہے''۔[10]

سید سلیمان ندوی کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر دور میں انھیں مقبولیت حاصل تھی چاہے وہ قدیم دور ہو یا جدید۔ حالانکہ ان کی تعلیم وتربیت قدیم طرز کے مطابق ہوئی تھی۔ اور وہ قدیم تعلیم کے نمائندے بھی تھے۔ لیکن پھر بھی وہ جدید افکار وخیالات اور رجحانات اور اس کے طرز طریقوں سے پوری

طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اور اس ماحول سے بھڑکتے نہ تھے۔ بلکہ نہایت پُرسکون طریقے سے اسے صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرتے اس لحاظ سے وہ قدیم وجدید کا سنگم تھے۔[11]

غرض علامہ شبلی نعمانی کی وفات نے سید سلیمان ندوی پر گہرے نقوش چھوڑنے کے ساتھ ساتھ ان پر بہت سی ذمہ داریاں بھی عائد ہوگئیں تھیں۔ خاص طور پر علامہ شبلی نعمانی کی وصیت ان کی سب سی بڑی ذمہ داری تھی۔ اسی کے ساتھ اور بھی کام تھے جو کہ ابھی ادھورے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے سید سلیمان کی تربیت ہی اس طریقے سے کی تھی کہ علامہ شبلی کے زمانہ حیات میں ہی ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے ان کا شمار طبقہ خاص میں ہونے لگا تھا۔ ان کا انداز وبیان ،فکرونظر تحقیقی وتاریخی مزاج، غرض ان کی ہر ایک ادا علامہ شبلی کا نقش ثانی معلوم ہوتا تھا۔ ان کے قلب وذہن میں علامہ شبلی کا عکس اس قدر رچ بس گیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد پونہ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری کے عہدہ کو (جو کہ اس وقت ایک عالمی منصب تھا) خیرباد کہہ دیا۔[12]

چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے دارالمصنّفین کا جو خاکہ[13] تیار کیا تھا سید سلیمان ندوی نے اپنا سارا کام چھوڑ کر اس کی تعمیر اور اپنے استاد مرحوم کے تمام ادھورے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا اپنی زندگی کا سب سے اہم مقصد بنالیا تھا۔ جس کے لیے انھوں نے اپنے کالج سے کچھ دن تک تو چھٹی لیتے رہے۔ اور ملازمت سے سبکدوشی کے لیے مناسب حیلے تلاش کرتے رہے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود بھی وہ دارالمصنّفین کی خبر رکھتے رہے۔ حسب ضرورت پونہ سے آکر کام دیکھ جاتے۔ بالآخر علامہ شبلی کے عقیدت مندوں اور اپنے احباب کے اصرار پر نومبر ۱۹۱۵ء میں پونہ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور آستانہ استاد پر آکر قیام پذیر ہوگئے۔[14]

ظاہر ہے دارالمصنّفین کا اتنا بڑا منصوبہ کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ شبلی نعمانی کے عقیدت مندوں اور تربیت یافتہ منتخب شخصیات کی ایک جماعت موجود تھی جو علامہ شبلی کے مشن میں دلچسپی لینے کیساتھ ساتھ اسے پورا کرنے کا سلیقہ بھی رکھتی تھی۔ چنانچہ یہ جماعت علامہ شبلی کی وفات کے تیسرے روز ۲۱/نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمیدالدین فراہی کی دعوت پر ''اخوان الصفا'' کے نام سے پانچ افراد پر مشتمل ایک مجلس تاسیس قائم ہوئی۔[15]

سید سلیمان ندوی کا شمار اعلیٰ ترین مصنفوں میں ہوتا تھا۔ اور انکے ساتھ معلم اور مؤرخین کی ایک جماعت موجود تھی۔ اس لیے دارالمصنّفین کا مقصد صرف سیرت کی تکمیل تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ سیرت

کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم موضوعات سے متعلق کتابوں کی تصنیف واشاعت اور ایک علمی رسالے کا اجراء بھی ان کا بنیادی مقصد تھا۔ اس رسالے کی اشاعت کے لیے دارالمصنّفین میں خود اپنا ذاتی چھاپے خانے کا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ دارالمصنّفین کے ارکان کی مسلسل کوششوں کے بعد جون ۱۹۱۶ء میں پریس قائم ہوگیا۔ اوراس کے اگلے ہی مہینے جولائی ۱۹۱۶ء میں دارالمصنّفین کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ ''معارف'' منظرعام پرآیا۔[۱۶]

۱۹۱۹ء تک سید سلیمان ندوی کی شخصیت جامع بن چکی تھی۔ مغرب کے لازمی علوم وفنون ندوہ میں انگریزی تعلیم کی تحصیل اور زبان پر دسترس سے لے کر مشرقی علوم وفنون کے انتہائے کمال تک دارالمصنّفین سے پونہ کالج تک سماجی بصیرت سے لے کر سیاسی شعور تک سید سلیمان ندوی کو ایک کامیاب رہنما کی حیثیت سے مقبولیت حاصل تھی۔ ان کے اندر قدیم وجدید کاامتزاج پایا جاتا تھا۔جس طرح دینی مسائل میں علماء ومشائخ کے حلقوں میں سید سلیمان ندوی کو وسعت نظر کے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح ان کی تاریخی اور اثری تحقیقات جدید محققین کے حلقوں میں ان کی بڑی قدرومنزلت تھی۔غرض وہ بڑی متنوع اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔[۱۷]

سید سلیمان ندوی کی سیاسی سرگرمیاں:

سید سلیمان ندوی کسی بھی زمانے میں یا دور میں کتنی ہی معمولی یا غیر معمولی سیاسی شخصیت کے حامل رہے ہوں لیکن ان کی سیاسی بصیرت اس وقت قابل تحسین ہوجاتی ہیں جب ان کی سیاسی باتیں اور دور رس نگاہوں نے ترکی سے متعلق انگریزوں کے رویوں کو بھانپ لیا تھا۔ انگریزوں سے مکمل آزادی کا مطالبہ سب سے پہلے سید سلیمان ندوی نے ہی قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان کو پورا یقین تھا کہ اس کے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی مسلمان دنیائے اسلام کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اگست کے اخیر میں مولوی عبدالباری صاحب کے نام ایک خط میں طویل پس منظر تمہید کے طور پر پیش کیا اور پھر عام ہندوستانی اور مسلمانوں کے لیے اپنا آزادی کا پیغام بھیج کر بات کا سلسلہ منقطع کردیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''مسلمان خود نصف صدی تک ہندوستان کی پالیٹکس سے الگ رہے۔ اور بے فائدہ ہندوستان کے باہر کوہ وبیابان ،بحروبر اور صحرا اورریگستانوں میں آوارہ پھرتے رہے۔ حالاں کہ منزلِ مقصود خود ان کا گھر تھا۔ اگر ان کا ہاتھ خود ان کے گھر میں مضبوط ہوتے تو

گھر سے باہر بھی ان کی آواز کی قوت ہوتی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان اور ہندوستانی ہونا ہندوستان سے باہر کسی ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے اس ذلت آمیز تخیل کے ساتھ بڑے سے بڑا دعویٰ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس کے منہ پر کہاں تک کھلتا ہے لوگ ہم سے کہتے ہیں اور ہم شرمندگی سے اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ تم جو اس زورِ قوت کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو آزاد کرنا چاہتے ہو پہلے تو تم خود آزاد بن لو۔ کیوں کہ تم جن لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہو ان کی گرفتاری کے حقیقی سبب بھی تم ہی ہو جو خود تمہاری تلواروں کا مقتول ہو اس کے سرہانے تم اب ماتم کیوں کرتے ہو''۔ ۱۸؎

سید سلیمان ندوی خالص مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ اور ان کا سیاسی شعار مسلمانوں کی حمایت کرتا تھا۔ اسلئے سیاست میں ان کی شرکت اکثر مواقع پر مذہب کے نمائندگی کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ سید سلیمان ندوی کا تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء میں شرکت، انگلستان، حجاز کا سفر، اور پھر موتمر میں شرکت مذہبی بنیاد پر ہی تھی۔

سید سلیمان ندوی ہندوستان میں قومی مسائل کے ساتھ ساتھ مسلم یونیورسٹی کا بھی خیال رکھا۔ ان کا دائرہ صرف آزادی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو مذہبیت کی طرف بھی راغب کررہے تھے۔ اس زمانے کے ان کے بہت سے ایسے رسالے اور سیاسی مضامین ہیں جو اسی بات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سید سلیمان ندوی صرف تنہا شخص نہیں تھے جو سیاست میں پیش پیش رہتے تھے بلکہ اس دور میں ان کے علاوہ بھی بہت سے علماء تھے تقریباً تمام علماء ہی سیاست میں شریک اور تحریک آزادی کے علمبرداروں میں تھے۔ غرض اس دور میں مذہبیت اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں رہ گئی تھیں بلکہ لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ سیاست سید سلیمان ندوی کے علمی کاموں میں رکاوٹ ہونے کے بجائے معاون ومددگار ثابت ہوئیں۔ ۱۹؎

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیفات میں محنت وجستجو، تلاش وتحقیق اور علمی بصیرت ودیدہ وری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس بناء پر ان کی تروتازگی ہمیشہ رہے گی اور محققین ومؤرخین اور علماء برابر ان سے فیض یاب ہوتے رہیں گے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ ۲۰؎

دارالمصنّفین میں اشاعتی کاموں کے دوران اپنی مختصر تصنیف ''حیات امام مالک'' شائع کی۔ یہ ان کی

کوئی مکمل تصنیف نہیں ہے بلکہ اس میں وہ مضامین ہیں جو انھوں نے الندوہ میں طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے امام مالک سے جو اپنی عقیدت ومحبت کا برملا اظہار کیا ہے اس سے بعض لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ وہ مالکی مسلک کے پیرو ہوگئے ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ آخری وقت تک حنفی ہی رہے۔ یہ ان کی فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ کی خوبیوں کا بھی برابر اعتراف کرتے رہے۔ امام مالک سے سید سلیمان ندوی کو عقیدت اس بنا پر ہوئی کہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دارالہجرۃ اور بانی اول فن حدیث تھے۔ سید سلیمان ندوی کو مؤطا سے اتنی انسیت تھی کہ اس پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا لکھتے لکھتے اتنا وسیع ہوگیا کہ وہ ایک کتابی شکل اختیار کر گیا۔ ۲۱

سید سلیمان ندوی کی علمی بصیرت:

سید سلیمان ندوی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصنیفی سرگرمیوں کے باوجود بھی انھوں نے معارف میں اپنے قیمتی ومفید مضامین کے ذریعے لوگوں سے قلمی جہاد کرتے رہے۔ مثلاً انگریزی اسٹیسٹمین میں واقعہ کربلا پر ایک قابل اعتراض مضمون نکلا جس کے خلاف سید سلیمان ندوی نے احتجاج کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب ''تاریخ اقوام اسلامیہ'' اور ڈاکٹر نکلسن کی ''تاریخ ادبیات عربی'' جب شامل ہوئی تو سید صاحب وہاں کے ارباب علم کو ان کتابوں کی طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام، اور پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام کے متعلق نہایت لغو اعتراضات اور گمراہ کن نظریات ہیں جو مسلمان کے لیے باعث شرمناک ہے۔ سید سلیمان ندوی کے اس احتجاج پر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کردی گئی۔ اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے مذہب پر دلآزار مضامین لکھے تو اس کے خلاف بھی انھوں نے آواز اٹھائی جس کی بناء پر ایڈیٹر نگار کو معافی نامہ لکھنا پڑا۔ ۲۲

برید فرنگ:

یہ سید سلیمان ندوی کی کوئی علمی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے ان سیاسی خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں لکھے جب وہ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے۔ سید سلیمان ندوی خالصتاً علمی آدمی تھے۔ انھیں سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ سیاست میں خود نہیں آئے تھے بلکہ لایا گیا تھا۔ وہ اپنے معاصرین کے اصرار پر سیاست میں تو آجاتے لیکن پھر وہ واپس اپنے علمی کاموں میں مشغول ہوجاتے۔ زیادہ تر مولانا محمد علی جوہر کی ایماء وخواہش کی خاطر سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ذاتی اخلاق ان کی صداقت اور حق

گوئی سے کافی متاثر رہے۔ سید سلیمان ندوی کا یہ خیال کہ جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا ان ہی کا کارنامہ ہے۔ ۲۳؎

سید صاحب سیاست میں مولانا حسرت موہانی کے کردار کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے شروع سے آخر تک جو اصول بنایا تھا اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آنے دی۔ ان کو یہ کہہ کر اپنا خراج عقیدت پیش کیا کہ اس عہد پُر فریب میں ان سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرنیں نہیں چمکیں''۔ ۲۴؎

☆☆☆

حواشی

۱؎ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (حصہ اول)، پروفیسر خورشید نعمانی ردولی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۰۳ء، ص: ۶۳ ۲؎ ایضاً، ص: ۶۳۔۶۴ ۳؎ ایضاً، ص: ۶۴

۴؎ معارف سلیمان نمبر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف، شبلی اکیڈمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۱۳

۵؎ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (حصہ اول)، پروفیسر خورشید نعمانی ردولی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۰۳ء، ص: ۶۴ ۶؎ ایضاً، ص: ۶۵

۷؎ اقبال نامہ، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، مکتوب ۲۱، اقبال نامہ بنام سید سلیمان ندوی، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۵۱ء، دسمبر ۱۹۲۰ء،

۸؎ معارف سلیمان نمبر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف، شبلی اکیڈمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۱۷

۹؎ علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی، مؤلفہ: طاہر تونسوی، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۹

۱۰؎ حیات سلیمان، از مولانا شاہ معین الدین، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۳۹۳ھ، ۱۹۷۳ء، ص ۶۴

۱۱؎ ایضاً، ص: ۶۸

۱۲؎ سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ڈاکٹر محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۳

۱۳؎ شبلی نعمانی تعمیر کا کام شروع ہونے سے صرف دو ماہ بعد ہی اپنا پورا خاکہ چھوڑ کر وفات پا گئے تھے جس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔

۱۴؎ سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ڈاکٹر محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۴

۱۵؎ انہی اسباب کی بنا پر ضلع پٹنہ کے باشندے (سید صاحب) نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اعظم گڑھ میں رہائش کر لی اور زندگی کے ۳۵ سال وہاں بسر کیے۔

۱۶؎ سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے، ڈاکٹر محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۷

۱۷؎ ایضاً، ص: ۱۱۵ ۱۸؎ ایضاً، ص: ۱۱۹ ۱۹؎ ایضاً، ص: ۱۳۰۔۱۳۱

۲۰؎ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف (ایک مطالعہ)، ج ۱، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، در مطبع معارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع گردید ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، دیباچہ ۲۱؎ ایضاً، ص: ۷

۲۲؎ معارف سلیمان نمبر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف، شبلی اکیڈمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۴۔۲۵

۲۳؎ یادرفتگاں، سید سلیمان ندوی، ج: ۱، معارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص: ۵۶۔۵۷

۲۴؎ ایضاً، ص: ۴۲۷۔۴۴۰